محترمہ بشریٰ بٹ ایم اے (اُردو و علومِ اسلامی)

کلامِ اقبالؒ میں تضاد کی نوعیّت

انسانی شخصیّت بڑی پہلو دار ہوتی ہے اور اسی وجہ سے انسان کے تصوّرات و نظریات میں بسا اوقات بڑا تضاد نظر آتا ہے۔ دنیا میں آج تک کوئی فرد بھی ایسا نہیں گزرا جس کے سر پر عصمت کا تاج ہو اور وہ بالکل میکانکی طور پر فکر و نظر کی ایک تنگ وادی میں ساری عمر آنکھیں بند کر کے گھومتا پھرے۔

خیالات کی وسعت، افکار و نظریات کی ہمہ گیری اور جذبات و احساسات کی گہرائی اور گیرائی کسی تخلیقی عظمت کی اساس ہیں۔ ایک انسان جب تک ان صفات سے متّصف نہیں ہوتا اُس کے اندر کسی قسم کی کوئی تخلیقی قوت پیدا نہیں ہو سکتی۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونقِ چمن
اَے ذوق اِس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یہ بات جس قدر اِس آب و گِل کے "جہان" کے بارے میں صحیح ہے اس سے زیادہ اشرف المخلوقات یعنی انسان کے متعلق صحیح اور درست ہے۔ ایک عام انسان اور نابغۂ روزگار میں البتہ ایک فرق یہ ضرور ہوتا ہے کہ ایک عام شخص اپنی سیرت کو متضاد خیالات و تصوّرات اور افعال و اعمال کا ملغوبہ بنا کر زندگی بسر کرتا ہے۔ اُس کی حیات "حُسنِ ترتیب" سے بالکل عاری ہوتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک عظیم انسان اپنی پہلو دار شخصیّت کے صالح عناصر کو چھانٹ کر اُن کے درمیان ایک ایسا معنوی ربط پیدا کرتا ہے کہ اُن کے اندر تضاد بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اور اسی ربط و ترتیب کے نتیجے میں ایک ایسا نظریہ ڈھل کر سامنے آتا ہے جو ہر اعتبار سے حیات آفریں ہوتا ہے۔ آپ دنیا کے ہر بڑے شاعر اور فلسفی کے افکار کا اگر ذرا گہرائی میں اُتر کر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُس کی بیشتر تخلیقی قوتیں متضاد افکار، نظریات اور جذبات و احساسات کے مابین "حکیمانہ مصالحت" کرانے میں صرف ہوتی ہیں۔

بعض سطح بیں آنکھوں کو ڈاکٹر اقبالؒ کے کلام میں بھی قدم قدم پر تضاد کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور اس لیے بڑی ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر مرحوم متضاد افکار و نظریات کا ایک پیکر خاکی تھا۔ لیکن یہ محض فریب نظر ہے۔ اقبال ہر عظیم شاعر اور فلسفی کی طرح اپنی پہلو دار شخصیت کے مختلف عناصر میں ایک ایسا حسین امتزاج پیدا کرتا ہے جس سے نہ صرف اُن کے مابین ایک معنوی ربط پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کے نتیجے میں حیات آفریں نظریات بھی جنم لیتے ہیں۔ آپ اگر ڈاکٹر مرحوم کے کلام کا ناقدانہ جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اپنی غیر معمولی خداداد ذہانت سے زندگی کے بعض ایسے شعبوں کے درمیان تطابق و توافق پیدا کیا جس کی نظیر پورے انسانی ادب میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

ذرا غور کیجیے کہ انسان کی عقلی زندگی اور اُس کی جذباتی زندگی میں کتنا بُعد پایا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ٹھوس اور یخ بستہ تعقلات اور گرم اور سیماب آسا احساسات قدرت کے دو الگ الگ کارخانے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اقبال نے ان دونوں کے درمیان اس خوبی کے ساتھ مصالحت پیدا کی کہ یہی ٹھوس عقلی مسائل جب اُن کی زبان فیض ترجمان سے ادا ہوتے تو دھکتے ہوئے انگارے نظر آنے لگے۔ عقل و جذبہ کی دوئی کا مٹا دینا ہی میرے نزدیک اقبال کے معجزاتِ سخن میں سے سب سے بڑا معجزہ ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر اقبال نے اپنی اُن دو حیثیتوں کے درمیان تضاد کو دُور کیا ہے جو اسلام کے ایک پُرجوش داعی اور عالمگیر افکار کے ایک زبردست مبلغ کے درمیان بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کا کلام اور اس پر جو نقد و نظر ہوئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود اُن کی اپنی زندگی میں لوگوں نے اس تضاد کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور انہیں اس کی طرف بڑے واضح الفاظ میں توجہ دلائی چنانچہ وہ مشہور انگریز مفکر ڈکنسن (Dickenson) کے ایک خط پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے لیکن باعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود ہے۔"

(اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۴۶۷)

پھر اسی تضاد کی تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعرا اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ

شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اوّلین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معیّن راہِ عمل رکھتی ہو۔ لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔ اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوع کی حیثیت سے انہیں یعنی مسلمانوں کو یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوونما اور ارتقا ہے۔ نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور ترتیب کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عملی کا مظہرِ اتم قرار دیا جائے . . . . مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی لغزش سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے۔"

اقتباس ذرا طویل ہو گیا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں، اقبال مرحوم کا پورا کلام اسی بنیادی تصور کی توضیح ہے۔ اور یہی وہ طرزِ فکر ہے جس کے مطابق اُس نے اپنے عالمگیر تصورات اور اپنے مذہبی معتقدات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی ہے۔

اقبال سب سے پہلے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔ اور انسانیت کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ آج اسلام کے اندر بہت سی ایسی آلائشیں شامل ہو گئی ہیں جن کا اس دین سے دُور کا کوئی تعلق نہیں۔ سجدہ و سجود اور اسی طرح کے ظاہری اعمال بجا لانے سے اسلام کے سارے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ چنانچہ وہ پورے ذوق سے کہتا ہے ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں | کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

پھر ایک دوسرے مقام پہ وہ یوں اظہارِ خیال کرتا ہے:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے | ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے
وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے | طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال | تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

اقبال نے مسلمانوں کے اس انحطاط پر بھی بڑی فکر انگیز بحث کی ہے اور انہوں نے بتایا ہے کہ علمائے دین جن کا کام امّتِ مُسلمہ کی رہنمائی کرنا تھا۔ وہ بیکار قسم کی بحثوں میں اُلجھ گئے ہیں اور وہ اپنی قوتیں اور صلاحیتیں ایسے کاموں میں صرف کر رہے ہیں جن کا عملی زندگی سے کوئی معمولی تعلق بھی نہیں :

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عین ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدّد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — اُمّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس بیکار قیل و قال کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنے اصل مقصد کو چھوڑ کر مادی زندگی کے خم و پیچ میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اور وہ بھی اب دوسری اقوام کی تقلید میں خاکِ وطن کو اپنی حیاتِ اجتماعی کی اساس قرار دیتا ہے۔ چنانچہ علامہ بڑے سوز کے ساتھ کہتے ہیں :

ہنوز از بندِ آب و گِل نہ رستی — تو گوئی رومی و افغانیم من

پھر ایک دوسرے مقام پر یہ ارشاد ہے :

مُسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

لیکن وطن کے معاملے میں بھی اقبال فکری توازن برابر قائم رکھتا ہے۔ وہ وطن پرستی کا مخالف ہے۔ مگر وطن دوستی کی تلقین کرتا ہے۔ اور جذب کے ساتھ کہتا ہے :

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اقبال کو اپنے وطن سے بے حد محبت ہے۔ چنانچہ بین الاقوامیت کے پرچار میں بھی وہ جب اپنے وطن کا تذکرہ کرتا ہے تو اس کے ایک ایک لفظ سے حُبِّ وطن کا پاک و فطری جذبہ اُمڈ آتا ہے۔ اس طرح وطن کے مصائب پر اس کا دل خون کے آنسو بہاتا ہے۔ فلک میں مادرِ وطن پیکرِ حسن و معصومیت بن کر اُس کے سامنے آتی ہے۔ اور وہ اسی نظارۂ سعید کا نقشہ جاوید نامہ میں بے حد کیف اور انتہائی پُرشوق الفاظ

میں کھینچا ہے :

"آسمان شق ہوتا ہے اور ایک مقدس و معصوم ترین حور نمودار ہو کر اپنے نورانی چہرہ سے نقاب سرکاتی ہے۔ اُس کی پیشانی ایک غیر فانی نور سے چمک رہی ہوتی ہے۔ اور اس کی آنکھیں سرور جاوداں سے لبریز ہیں۔ تن نازک پر لباس اتنا سُبک ہے کہ ابر کو شرماتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے تار و پود گلاب کی پنکھڑیوں کی باریک باریک رگوں سے بنائے گئے ہیں۔

لیکن یہ رعنائی کا مجسمہ غلامی کی زنجیروں میں بے طرح جکڑا ہوا ہے اور جب وہ اسے قید و بند کے عالم میں دیکھتا ہے اور اس کی آہِ جگر دوز اور نالۂ درد و خاک کو سُنتا ہے تو اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ مولانا روم اسے بتلاتے ہیں کہ یہ تمہارے ملک کی روح ہے۔ اس کے بعد روحِ ہند کی فریاد کو اس نے جس انداز میں نظم کیا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ناسور پڑ گئے ہیں جو اس راہ سے رس رہے ہیں اور آنکھیں خون برسا رہی ہیں۔ وہ غدارانِ وطن صادق و جعفر کو نہایت ہولناک مقام میں دیکھتا ہے اور انتہائی غم و غصہ کے عالم میں اُن کو آدمیت کی ذلت، دین کی خجالت اور وطن کی لعنت کہتا ہے۔

جہاں تک علامہ اقبالؒ کی وطن سے محبت کا تعلق ہے اُس میں وہ کسی بڑے سے بڑے محب الوطن سے پیچھے نظر نہیں آتے، مگر وطن کو وہ مقامِ کبریائی پر فائز کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوئے بلکہ وطن کو خدا مان لینے سے جارحانہ قوم پرستی کا جو نظریہ معرضِ وجود میں آتا ہے وہ اسے انسانیت کے لیے بڑا عذاب تصور کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک انسان نے دورِ جدید میں اپنے نظامِ فکر اور نظامِ اخلاق کی وطنیت پر بنیاد رکھ کر سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ وطنیت ہی اس کا دین اور یہی اس کا ایمان بن گیا ہے اور وہ اپنے اعمال کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اس معبودِ باطل سے جواز حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبال جارحانہ قوم پرستی کے اس تصور کو جو انسانیت کی فطری وحدت کو پارہ پارہ کر کے اسے متحارب گروہوں میں تقسیم کرتا ہے سخت مخالف ہے۔ اور اس نئے بُت کو توڑنا اپنا سب سے بڑا اسلامی فرض سمجھتا ہے۔ اس میں شُبہ نہیں کہ انسان کا جس سرزمین سے تعلق ہو اُس سے وہ فطری طور پر مانوس ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسانی روح خاک کی پستیوں میں اپنے آپ کو اس طرح سے آلودہ کرے کہ اُس کی قوتِ پرواز جاتی رہے۔ انسان فطری طور پر ایک روحانی پیکر ہے اور اس وجہ سے زمان و مکان کی قیود میں

اپنے آپ کو جکڑنے کے لیے رضامند نہیں ہو سکتا ؎

فطرت نے مجھے بخشے ہیں وہ جوہر ملکوتی — خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دِلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

پھر ضربِ کلیم میں وہ کہتا ہے ؎

نہ میں عجمی و نہ ہندی نہ عراقی و حجازی — کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی
تو مری نظر میں کافر، میں تری نظر میں کافر — تیرا دیں نفس شماری، میرا دیں نفس گدازی

اقبال نے نظم و نثر میں ہر ممکن طریق سے وطن پرستی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اقوام و ملل کی تنظیم، بین الاقوامیت کی تشکیل اور اخوتِ انسانی کی تربیت کے لیے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ وطنی اور نسلی امتیاز کے جارحانہ نظریات کو ختم کر دیا جائے۔ وطنی اجتماعیت ایک تنگ دائرہ ہے جس میں انسانی اخوت و مساوات اطمینان کا سانس نہیں لے سکتی۔ قومیت کے جڑ پکڑ لینے اور وطنیت کے جذبہ کے پابند ہو جانے سے دوسروں کے خلاف نفرت، تعصّب، تنگ نظری و احساس برتری، خود پرستی و ہوسناکی کے جراثیم بکثرت پھیل جاتے ہیں جو انسانیت کے جسم کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ قوتِ عمل کا مظہرِ اتم دائرۂ قومیت نہیں بلکہ حلقۂ انسانیت اور رشتۂ اخوت ہے۔ جو صرف اسلام کی بارگاہ سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک جیسے کہ میں نے شروع میں گذارش کی تھی کہ انسانی حیاتِ اجتماعی کے لیے کوئی ایسی بنیاد نہیں جو اسلام سے وسیع تر اور اس سے زیادہ ہمہ گیر ہو۔